بشیر احمد ڈار

چینی تصوف

چینی تصوف کا آغاز اور نشوونما لاؤزی اور اس کے شاگردوں کے نام سے منسوب ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لاؤزی سے پہلے بھی چین میں چند بزرگ ایسے تھے جو اپنے زمانے کے سیاسی حالات سے مجبور ہو کر عملی زندگی سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ انھوں نے عوام اور امرا دونوں سے مایوس ہو کر اپنی ذاتی نجات کے لیے پہاڑوں کو اپنا مسکن بنا لیا۔ کنفیوشس کو ایسے کئی افراد ملے جنھوں نے ایسی راہبانہ زندگی اختیار کی تھی اور انھوں نے کنفیوشس کی کوششوں کا مذاق بھی اڑایا۔ ان کا خیال تھا کہ اس شخص کو معلوم ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا تاہم وہ اپنی کوشش سے منہ نہیں موڑتا۔ اس اعتراض کے جواب میں کنفیوشس کے ایک شاگرد نے اپنے استاد کے دفاع میں کہا: معاشرتی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا ایک معیوب فعل ہے۔ اگر ایک خاندانی زندگی میں خورد اور بزرگ کے مابین رشتے کے قوانین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تو بڑے چھوٹے یا بادشاہ اور رعایا کے مابین تعلقات کے قوانین سے کیسے بے پروائی برتی جا سکتی ہے۔ محض ذاتی نجات کی خاطر اس اہم تعلق کو نظر انداز کرنا کسی طرح بھی درست نہیں کہا جا سکتا۔[1]

ان صوفیوں نے جنھوں نے دنیا کو ترک کر دیا، ترک کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے اس نظریے کی حمایت میں ایک فکری

۱۔ فنگ یولان (چینی فلسفے کی مختصر تاریخ) نیو یارک ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۲۳، ۱۲۴۔

نظام بھی پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام ایک چینی صوفی یانگ چو (Yang Chu) نے سر انجام دیا۔ اس کی زندگی کے تفصیلی حالات کا کوئی علم نہیں اور نہ اس کی تاریخ پیدائش اور وفات کا کچھ پتہ ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ اس کا زمانہ ۴۴۰ اور ۳۶۰ قبل مسیح کے درمیان ہے۔ اس کے دو بنیادی تصورات تھے۔ پہلا یہ کہ ہر ایک کو صرف اپنی فکر کرنی چاہیے اور دوسرا یہ کہ اس دنیا کی ہر چیز سے نفرت کرنی چاہیے لیکن زندگی کی پوری قدر کرنی چاہیے۔ یہ دونوں ایک ہی نظریے کے دو پہلو ہیں۔ لی تزو (Lieh Tzu) نامی کتاب میں ایک جگہ ایک شخص نے یانگ چو سے سوال کیا: اگر اپنے بدن کے ایک بال اکھاڑ کر ساری دنیا کو بچا سکو تو کیا تم اس کے لیے تیار ہو گے؟ اس نے کہا کہ دنیا ایک بال سے نہیں بچ سکتی۔ اس پر اس شخص نے کہا فرض کرو ایسا ممکن ہو تو کیا؟ اس پر یانگ چو خاموش رہا۔ یہ شخص باہر گیا اور یانگ چو کے شاگرد سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا: فرض کرو تمہیں کہا جائے کہ اگر تم اپنی کھال کا کچھ حصہ اکھاڑ دو تو تمہیں دس ہزار سونے کے سکے ملیں گے تو کیا تم تیار ہو جاؤ گے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں۔ اگر تمہیں اپنے کسی عضو کو کاٹ دینے [illegible] سلطنت مل جائے تو پھر؟ وہ خاموش رہا۔ [illegible] شاگرد نے جواب دیا کہ کھال کے مقابلے میں بال غیر اہم ہے اور ایک عضو کے مقابلے میں کھال بالکل بے حیثیت لیکن کھال کے بہت سے ٹکڑے مل کر ایک عضو کے برابر اہم ہو جاتے ہیں۔ ایک بال جسم کے ہزاروں حصوں میں سے ایک ہے تو ہم اس سے کیسے بے پروائی برت سکتے ہیں؟

یانگ چو کے دوسرے اصول کے متعلق مندرجہ ذیل تشریح ملتی ہے:

"ہماری زندگی ہماری ملکیت ہے اور ہمیں اس سے بے شمار فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ بادشاہ بننے کی عزت سے کہیں زیادہ [illegible] اگر کسی شخص کو ساری دنیا کی دولت [illegible] پر [illegible] کے برابر نہیں۔ اگر ہم اس کو ایک بار کھو دیں تو پھر اس کو دوبارہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔"

لاؤزی اور [illegible] کی شخصیت [illegible] سے ظاہر ہوتا ہے [illegible]

قدر و قیمت اس دنیا سے زیادہ کرتا ہے لیکن جسے یہ دنیا مل جائے۔ وہ شخص جس کے عمل سے ظاہر ہو کہ وہ اپنے نفس کو اس دنیا سے زیادہ عزیز رکھتا ہے تو ممکن ہے اسے اس دنیا کا انتظام سپرد ہو سکے۔"

اسی طرح چوانگ زو (Chuang Tzu) نامی کتاب کے ایک باب میں مذکور ہے: اگر تم کوئی اچھا کام کرو تو اچھی شہرت سے بچو اور اگر برا کام کرو تو سزا سے بچو اور درمیانے اعتدال کا راستہ اختیار کرو اور اسے اپنا اصول بنا لو۔ اس کے بعد تم اپنے جسم کی حفاظت اور اپنے والدین کی دیکھ بھال بہ آسانی کر سکو گے۔ اور اس طرح اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر رخصت ہو گے۔ اسی طرح ایک دوسرے باب میں مذکور ہے: پہاڑ کے درخت خود اپنے دشمن ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ اپنے پیچھے یعنی فنا ہونے کی خود ذمہ دار ہے۔ لونگ کھانے کی چیز ہے اس لیے لونگ کا درخت کاٹ دیا جاتا ہے۔ ایک آدمی جس کی قابلیت کی شہرت ہو اس کا حشر بھی لونگ کے درخت کا سا ہو گا۔ چنانچہ بے فائدہ چیزوں کی افادیت کی جگہ کی کمی ہے کیونکہ ان کا غیر مفید ہونا ہی ان کے شخصی وجود کے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اسی کتاب کے مذکورہ باب میں ایک شاہ بلوط کے درخت کا ذکر ہے جو کہ اسے کاٹنے سے بچ گیا۔ اس ایک شخص سے خواب میں کہا: میں کافی عرصہ سے غیر مفید ہونے کی کوشش کر رہا ہوں، کئی مرتبہ ایسے آئے کہ میں موت کے منہ سے بال بال بچا لیکن اب میں نے غیر مفید ہونا سیکھ لیا ہے جو میری ذات کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ اگر میں کار آمد ہوتا تو کیا میں اتنی عظیم الشان جسامت کا مالک ہو سکتا تھا۔ ایک دوسری جگہ مذکور ہے: کیا فائدہ مند چیزوں کی افادیت تو سب جانتے لیکن بے فائدہ چیزوں کی افادیت کا کسی کو علم نہیں ہے۔ حالانکہ بے کار رہنے یا بیٹھنے کا حق جیسے پر زندگی کی بقا کا دار و مدار ہے۔

ایک بے کار شخص جو اس طرح زندہ رہنے کے راز سے واقف ہو چکا ہے اس کو چاہیے کہ وہ زیادہ بیدی کا حرکت نہ کرے اور زندگی کے کاموں کی طرف دھیان نہ دے

بلکہ اس معاملے میں بھی اعتدال کا راستہ اختیار کرے۔

چینی تصوف کے اس پہلے دور کی خصوصی صفت جوگ گیری کا رجحان ہے۔ جس سے یانگ چو کے پیرو دنیا کے مصائب سے بچ کر پہاڑوں کے غاروں یا اسی طرح جنگلوں میں جا کر پناہ گزیں ہو جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنی زندگی کی بقا اور حفاظت اور مصائب سے محفوظ رہنے کا ایک طریقہ اختیار کیا۔ اگرچہ یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہو سکے۔ اس دور میں تصوف کا فکری سرمایہ کچھ زیادہ نہ تھا البتہ دوسرے دور میں لاؤزی اور اس کے پیروؤں کی کوشش سے اس نظریۂ حیات میں کافی گہرائی پیدا ہوئی۔ ان کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ یہ دنیا بے شک ایک تغیر اور مسلسل تغیر کا نام ہے لیکن اس تغیر کی بنیاد چند غیر متغیر قوانین پر قائم ہے۔ اس دنیا کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ان قوانین سے واقفیت ضروری ہے۔

چینی تصوف کا دوسرا دور حقیقی دور حکیم لاؤزی (Lao Tzu) سے شروع ہوتا ہے۔ حکیم لاؤزی کس جگہ اور کب پیدا ہوا؟ اس کے متعلق مورخین اور ناقدین میں کچھ زیادہ اتفاق نہیں۔ بعض کے نزدیک وہ ۶۰۴ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کے حالات بھی اسی طرح تقریباً نامعلوم ہیں۔ کنفیوشس اس سے کافی چھوٹا تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ لاؤزی سے ملا بھی تھا اگرچہ اس ملاقات کے بعد ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو متاثر نہ کر سکا۔ جب حالات ناسازگار ہو گئے تو لاؤزی نے آباد شہروں کو ترک کر دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ سرحد عبور کرنے لگا تو عام مروجہ روایت کے مطابق سرحد کے محافظ نے اس سے التجا کی کہ چونکہ آپ اس علاقے کو چھوڑ رہے ہیں اس لیے ہماری ہدایت کے لیے ایک کتاب قلمبند کر دیجیے تاکہ ہماری راہنمائی ہو سکے۔ اس درخواست پر لاؤزی نے وہ کتاب لکھی جسے صحیفۂ دین و قوت کہا جاتا ہے۔[1]

۱۔ اس کتاب کا چینی نام "تاؤ تے چنگ" ہے۔ تاؤ (Tao) جس کو عام طور پر طاؤ بھی کہا جاتا ہے کے معنی طریقہ یا مسلک یا دین کے ہیں۔ تے (Te) کے معنی قوت [illegible] چنگ [illegible]

لاؤزی کے نظام فکر کا بنیادی فلسفہ تاؤ یا راستہ ہے۔ یہ اصطلاح بہت سے معنوں میں استعمال ہوتی ہے [illegible] قوانین اخلاق اور اصول یا مابعد الطبیعیاتی سچائی مراد لی جاتی ہے۔ عام طور پر کہا گیا ہے کہ اس [illegible] طاقت کے لیے عموماً سلبی صفات استعمال ہوتی ہیں۔ اسی طرح لاؤزی نے طاؤ کو جب مابعد الطبیعی اصول کی حیثیت میں پیش کیا تو بھی سلبی طرز اختیار کیا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے "اس آسمان اور زمین کے وجود میں آنے سے پہلے ایک وجود تھا جو بے صورت اور مادے سے بالاتر تھا۔ جس کی کوئی آواز نہ تھی [illegible] لا تغیر تھا جو اپنے وجود کے لیے کسی پر منحصر نہیں [illegible] وہ ہر جگہ جاری و ساری ہے ہم اسے کائنات کی ہر شے کا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں گویا وہ مادر کائنات ہے۔ ہم اس کے صحیح نام سے واقف نہیں لیکن ہم اسے "طاؤ" کے عارضی نام سے پکارتے ہیں" (باب ۲۵)

طاؤ کا ایک پہلو جس کی سلبی صفات کا بیان تذکرہ کیا گیا ہے حقیقت مطلقہ کی وہ منزل ہے جسے ابن عربی اور جیلی الاحدیت کا نام دیتے ہیں۔ اس منزل میں بقول جیلی ذات حق [illegible] مطلقہ ہے جو ہر تعین سے بالا ہے۔ [illegible] اسماء و صفات کا کوئی [illegible] ظاہر نہیں [illegible] لاؤزی کہتا ہے "طاؤ ازلی اور نام سے بالا ہے [illegible] جونہی [illegible] ہو گئے" (باب ۳۲) "طاؤ راز سربستہ اور نام سے بالا ہے" (باب ۴۱۔ آخری سطریں) چونکہ وہ اسما اور تعینات سے بالا ہے اس لیے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ ہم اسے ظاہر کرنے کے لیے الفاظ کا سہارا لینے پر مجبور ہیں اس لیے ہم نے اسے طاؤ کے نام سے پکارنا شروع کیا لیکن جونہی ہم نے اسے پکارنا شروع کیا تو گویا وہ تعینات کی دنیا میں آ گیا۔ التعین کی حالت میں وہ اسماء و صفات [illegible]

۱۔ زرتشت کے ہاں "رتا" اور آریوں کے ہاں [illegible] کے تصورات [illegible] چینی تصور طاؤ سے مشابہ ہیں اور جن کا مفہوم بھی تقریباً یکساں ہے [illegible] کے ہاں "کلام" ([illegible]) اسلام میں فطرت اللہ اور سنت اللہ کی اصطلاح اسی مفہوم میں مستعمل ہوتی ہے۔

۲۔ جیلی، الانسان الکامل (اردو ترجمہ از مولوی فضل میراں) مطبوعہ اسلامیہ سٹیم پریس لاہور، باب اول، صفحہ ۲۰

سے بالا ہے۔ تخلیق کی حالت میں وہ نام سے پکارا جانے لگا۔ اور اسی واسطے ہی کائنات کا وجود اس سے صادر ہوا۔ وہ طاؤ جس کا نام ذکر کرتے ہیں وہ مطلق نہیں جو اسما ہم اس کے ساتھ منسوب کرتے ہیں وہ اسما مطلق نہیں۔ وہ بے نام آسمان اور زمین کا منبع ہے جبکہ نام والا کائنات کی ہر شے کی ماں ہے۔

(باب اول۔ آغاز)

وجودی صورت میں طاؤ ہر شے ماسوا ساتھ لا وجود کا نام دیا گیا ہے۔ اس کائنات کی تمام چیزیں وجود سے پیدا ہوئی ہیں لیکن وجود عدم وجود یا عدم محض سے پیدا ہوتا ہے (باب چالیس)
اس بیان کی تشریح کرتے ہوئے ہومز ویلش (Holmes Welch) کہتا ہے کہ کائنات کے آغاز میں مادے کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ چونکہ طاؤ امکان (یعنی عدم) بھی تھا۔ اس لیے اس ڈھیر میں مختلف اشیاء کا وجود نہ تھا۔ گویا کچھ نہ ہونے کے لیے وہاں عدم محض تھا۔ جس میں اس ڈھیر سے مختلف اشیاء نے روپ دھار لیا۔ یعنی یہ عدم سے ہی پیدا ہوا؟ اس عدم کے باعث ہی سے یہ ڈھیر انفرادی اشیاء کی شکل میں تبدیل ہوا گویا تمام اشیاء عدم سے پیدا ہوتی ہیں۔[1] لیکن فنگ یولان کے نزدیک وجود اور عدم وجود سے مراد محض طاؤ کی وہ یکتائی اور لاتعین ہے۔ طاؤ اسما اور صفات سے بالا ہے اور اس لیے وہ عدم ہے اور اسی سے تمام چیزیں ظہور پذیر ہوتی ہیں مثلاً باب ۴۲ میں کہا ہے طاؤ نے ایک یعنی واحد پیدا کیا۔ واحد سے دو اور دو سے تین اور تین سے یہ تمام کائنات" (آغاز) فنگ یولان کے مطابق ایک یا واحد سے مراد وجود ہے یعنی طاؤ نے ایک کو پیدا کیا۔ یہ کہنا کہ طاؤ نے ایک پیدا کیا اس سے مراد یہ ہے کہ عدم سے وجود ظاہر ہوا۔ اور ایک سے دو اور دو سے تین اور تین سے یہ کائنات ظاہر ہوئی سے مراد صرف یہ ہے کہ اس تمام کائنات کا ظہور اسی وجود سے ہوا۔[2]

۱: ہومز ولش The Parting of the Way (لندن ۱۹۵۸ء) صفحہ ۳۳ بحوالہ طاؤ چینی [illegible]
حکمت الٰہی (نیویارک [illegible]) [illegible] تاریخ نمبر ۲، ۲۰

۲: فنگ یولان A Short History of Chinese Philosophy چینی فلسفے کی مختصر تاریخ (نیویارک ۱۹۵۰ء) صفحہ ۹۶، ۹۷

الغرض طاؤ کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو ظاہری ہے جو اس خارجی کائنات یعنی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس سے ہم اپنے مشاہدے کی بنا پر پوری طرح واقف اور باخبر ہیں۔ حقیقت مطلقہ کا یہی پہلو ہے جسے ابن عربی حق کہتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو باطنی یا لاتعین کا ہے۔ اس پہلو کا ہمارے پاس کوئی علم نہیں۔ اگر کوئی شخص انتہائی ریاضت کے بعد اپنی خواہشات کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی اسے حقیقت مطلقہ کے اس باطنی پہلو کا علم حاصل نہیں ہو سکتا جو چیز ہم محسوس کر سکتے ہیں وہ محض باطنی ماہیات ہیں جو حقیقت مطلقہ کے باطنی پہلو کے مظاہر ہیں جس طرح یہ کائنات اس کے ظاہری پہلو کی مظہر ہے لیکن حقیقت مطلقہ اپنی ذات میں ماہیت ہی اور ان دونوں امتیازات سے بالکل بالا ہے۔ یہ امتیازات محض ہمارے علم کے باعث پیدا ہوتے ہیں اور یہ ثنویت اپنی ذات کے باوجود واحد ہے یا ہم اسے وحدت میں ثنویت کا نام دے سکتے ہیں۔ اسی لیے لاؤزے کہتا ہے کہ یہ مادی کائنات اور باطنی ماہیات ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہیں حقیقت مطلقہ جو اپنی ماہیت کے لحاظ سے انسانی علم و عرفان اور تمام تعینات سے ماورا ہے جسے ابن عربی الاعیان [illegible] خالصہ کہتے ہیں۔ لاؤزے کی اصطلاح میں یہ وہ باطن ہے جو باطن کی تاریکیوں سے بھی زیادہ تاریک ہے۔ پہلے باب میں وہ کہتا ہے:

صرف وہی شخص جو خواہشات سے ہمیشہ کے لیے خلاصی پا چکا ہو باطنی ماہیتوں کو دیکھ سکتا ہے وہ شخص جو خواہشات میں ملوث ہے صرف خارجی مظاہر دیکھ سکتا ہے۔ یہ دونوں باطنی ماہیتیں اور خارجی مظاہر ایک ہی سرچشمہ سے نکلے ہیں مگر ان کے نام مختلف ہیں اس سرچشمہ کو ہم باطن کہتے ہیں جو باطن سے بھی زیادہ تاریک ہے۔ یہ وہ دروازہ ہے جس سے باطنی ماہیات نکلتی ہیں۔

طاؤ کے باطنی پہلو کے لیے لاؤزے نے لا اسم، لاتعین، عدم وجود وغیرہ کی اصطلاحات کثرت سے [illegible]

۱: دیکھیے عفیفی۔ ابن عربی کا فلسفہ تصوف (انگریزی) صفحہ [illegible]

۲: باب ۴ میں طاؤ کے متعلق لاؤزے کہتا ہے [illegible] پہلے موجود تھا" یہاں طاؤ سے [illegible]

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے ظاہری پہلو کے لیے وہ طاؤ، وجودِ مطلق، ماورا اور واحد[1] کی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں۔ طاؤ کے اس ظاہری پہلو سے کائنات کا وجود کیسے ظاہر ہوا؟ اس کے لیے لاؤزی کے ہاں ماورا کی اصطلاح موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک کائنات کے ظہور میں طاؤ کا عمل تخلیقی نہیں بلکہ محض انفعالی ہے۔ گویا کہ کائنات کا خالق نہیں کہہ سکتے صرف کائنات کا [illegible] سے ہوا[2] وہ [illegible] ہے کہ [illegible] کا انتظام [illegible] چنانچہ باب ۳۴ میں کہتا ہے: "[illegible] نے [illegible] واحد کو بھر لیا تھا[3] آسمان [illegible] کے باعث صاف ہو گیا [illegible] دنیا [illegible] روحانی [illegible] روحانیت پیدا ہوئی۔

(بقیہ نوٹ گزشتہ صفحہ) [illegible] انسان کے [illegible] سے [illegible] ماورا ہے۔ اس حقیقت مطلقہ کا دوسرا پہلو جسے ہم ابن عربی [illegible] وحدت وجودی [illegible] اصطلاح کی رو سے [illegible] حق کہتے ہیں۔ وہ [illegible] خدا کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ حقیقت مطلقہ کا ایسا [illegible] ہے [illegible] الحق المخلوق به [illegible] دو حقائق میں کوئی [illegible] رشتہ نہیں، بلکہ محض ایک [illegible] نسبت ہے۔

۱: حقیقت مطلقہ کی [illegible] جسے ابن عربی [illegible] مرتبہ الوہیت مقام [illegible] کے نام سے پکارتا ہے۔ اس [illegible] خارجی کائنات کا وجود [illegible] ذات مطلق [illegible] دیکھیے [illegible]

۲: دیکھیے لاؤزی کی کتاب [illegible] آخری سطریں:

"طاؤ نے [illegible] طاؤ کی قوت نے ان کی پرورش کی۔ ان کی فطرت کے مطابق ان کو شکلیں [illegible] ان کو تکمیل تک پہنچایا۔ ۔ ۔ ۔"

۳: لن یوٹانگ [illegible] نے [illegible] کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"قدیم [illegible] کی [illegible] واحد کی حامل تھیں [illegible] ساری تھا۔

وادیاں بھرپور ہو گئیں۔ اور تمام مخلوق کو زندگی ملی اور ان کی نسل میں افزائش ہوئی اور انسان کو شعور میں عزت کا مقام حاصل ہوا۔ یہ تمام اس "مدامدہ" کا نتیجہ ہیں۔ اگر دامدہ کا علم انھیں حاصل نہ ہوتا تو آسمان پھٹ جاتا ہے، زمین الٹ پلٹ ہو جاتی، نفوس روحانی ختم ہو جاتے، وادیاں خشک ہو جاتیں اور مخلوق کی تمام نسلیں صفحۂ ہستی سے نابود ہو جاتیں۔

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت کے مطابق طاقت ان فطرت ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس کے افعال میں ایک اتنی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جو ایک جاندار شخصیت کی علامت نہیں ہے جیسا کہ ابتدائی دور کا قرآنی تصور ہے۔ طاقت ایک ایسا وجود مطلق نہیں ہو سکتا کہ دعاؤں اور فریادوں سے متاثر ہو جائے گا اور انسانوں کے ہر ایک انسانوں کی ندامت سے متاثر ہو کر ان کو اپنے ... سے ... دے۔ اس کے ہاں تو ایک جبری قانون جاری ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔ اس کے ہاں کوئی حاجت روائی نہیں۔ وہ تو صرف ایک آدمی کا اسم بھی ہے۔ (۹)

صوفیانہ مذہب کی ... حقیقتیں جو تمام مذاہب کے ہاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ لاؤزی کے ہاں ان کی تلاش ہے تاہم کہیں کہیں ان کے اثرات ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً باب ۲۱ میں حقیقت مطلقہ کے غیر ادراکی شعور اور تجربے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ لاؤزی کہتا ہے: آنکھ اس کو دیکھتی ہے لیکن اس کے نور کی کوئی شعاع اسے نظر نہیں آتی اس لیے اسے غیر مرئی کہا جاتا ہے۔ کان سننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انھیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اس لیے اسے ناقابلِ سماعت کہا جاتا ہے۔ ہاتھ اس کو پکڑنے کی جد و جہد کرتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہو پاتے، اس لیے اسے ماورائے ادراک کہا جاتا ہے۔ یہ تینوں صفات مل کر ایک جگہ آ موجود ہوتی ہیں۔ باب ۲۱ میں وہ کہتا ہے: "طاؤ انسانی حواس اور ادراک کے پیمانوں سے بالا ہے تاہم اس میں صورتیں مضمر ہیں۔ اشیاء کا وجود اس میں پایا جاتا ہے۔ اس سے

۹۔ تکفیر ... [illegible]

اور سب سے بڑھ کر ایک قسم کی خوشی ہے۔ تمام صوفیانہ ادب کے برعکس [illegible] ان پایا جاتا ہے وہ جوش اور والہانہ عقیدت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ اس چیز کا اعتراف کرتے ہوئے وہ باب ۳۵ میں کہتا ہے۔ موسیقی کی آواز اور اچھے کھانے کی خوشبو مسافر کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں لیکن وہ پیغام جو تاؤ سے حاصل ہوتا ہے ہر قسم کی کشش سے عاری ہے۔ اگر کوئی اس کو دیکھنا چاہے تو یہاں کوئی چیز نہیں جسے وہ دیکھ سکے۔ اگر اس کو سننا چاہے تو یہاں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

اس حقیقت کے علاوہ یعنی خدا کو پہچاننے اور اس کا علم حاصل کرنے کے لیے جو طریقہ لاؤتزے تجویز کرتا ہے وہ تقریباً دوسرے صوفیانہ نظاموں سے زیادہ مختلف نہیں۔ خواہشات پر قابو پانا سب سے پہلا ضروری قدم ہے (باب ۱۹) اس کے ساتھ ریاضت لازمی ہے جس کے باعث انسان اپنے آپ کو خارجی دنیا سے منقطع کر لیتا ہے۔ تمام [illegible] اور [illegible] دروازوں کو بند کر کے تیز روشنی اور [illegible] آنکھوں [illegible] (باب ۱۲) پانچ رنگ انسان کی آنکھوں کو اندھا کر دیتے ہیں۔ پانچ راگ انسان کے کانوں کو بہرا کر دیتے ہیں۔ پانچ مزے زبان کی لذت کو خراب کر دیتے ہیں اس لیے عارف روح کی غذا کو مہیا کرتا ہے لیکن جسم کی طرف توجہ نہیں دیتا (باب ۱۲)۔ اسی طرح باب ۵۲ میں وہ کہتا ہے۔ راستے[1] اور دروازے[2] بند کر لو تو تمہاری طاقت کم نہ ہوگی۔ اگر تم نے راستوں اور دروازوں کو کھول ڈالا اور اپنے کاموں میں منہمک ہو گئے تو [illegible] جس طرح اچھی نظر سے مراد ہے کہ [illegible] سے چھوٹی چیز دیکھ سکے [illegible] طاقت سے مراد ہے کہ تم کمزوری [illegible] شخص جو خارجی روشنی سے استفادہ کرنے کے بعد داخلی روشنی کی طرف رجوع کر سکتا ہے ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت [illegible] کی طرف واپس آنے کا مطلب [illegible]۔

۱: راستوں سے مراد [illegible]

۲: [illegible]

عقل و استدلال کی بجائے جہالت اور کم علمی اس راستے کا بہترین زاد راہ ہے۔ چونکہ طاؤ تمام وجود کا سرچشمہ ہے اس لیے جب طاؤ کا علم حاصل ہو گیا تو ہر شے کے علم سے انسان بے نیاز ہو جاتا ہے۔ گھر سے باہر نکلے بغیر ہی آدمی ہر شے کے علم سے استغناء پا لیتا ہے (باب ۴۷) علم کی تحصیل سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر روز نئی نئی چیزیں سیکھتا چلا جائے۔ اس کے برعکس طاؤ کے حصول کا تقاضا یہ ہے کہ ہر روز ذہن [illegible] (باب ۴۸) یہ چوانگ زو کے قول [illegible] مقدار ہے کہ العلم حجاب اکبر [illegible] زیادہ عرفان کے راستے میں [illegible] چنانچہ باب ۱۹ میں لاؤزی اس کی تعلیم دیتا ہے کہ علم کو ترک کر دو اور حکمت کو بالائے طاق رکھ دو۔ طاؤ تک پہنچنے کے لیے عقل و حکمت کی بجائے جہالت اور عقل سے دستبرداری کی ضرورت ہے۔

اخلاقیات میں لاؤزی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کو ہر قسم کے عمل سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس کے لیے چینی زبان کی اصطلاح وو وائی (Wu Wei) ہے جس کا مفہوم ہے لا عملی[1]۔ جو شخص جتنا کوئی شخص عمل سے رکا رہے گا اتنا ہی زیادہ اپنے اور دوسروں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔

ہندوستان کے اہل ایسا ہی بے عملی کا تصور موجود تھا۔ ہندو مفکرین کے نزدیک انسان کے ہر عمل سے ایک خاص نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو انسان کو [illegible] کے ایک سلسلہ اور [illegible] میں مبتلا کر دیتا ہے۔ چونکہ اخلاقی زندگی کا [illegible] آواگون کے چکر سے نجات حاصل کرنا ہے اس لیے ان کے نزدیک ہر قسم کے عمل سے کنارہ کشی لازمی اور ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اگر آپ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ آپ کا ہر عمل اچھا یا برا کوئی ایسا نتیجہ پیدا کرے گا جس سے آپ بے شمار زندگیوں کے لامتناہی دور میں پھنس جائیں اور پھر یہ بھی تسلیم کر لیں کہ اس چکر سے نجات حاصل کرنا ہی مقصود انسانیت ہے تو اس کے بعد آپ کے لیے کوئی چارہ کار نہیں کہ آپ ہر انسان کو مکمل لا عملی کا سبق

---

[1] لا عملی کی اصطلاح بے عملی کی بجائے اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ موخر الذکر کے مفہوم میں بے حسی اور کاہلی شامل ہے حالانکہ لاؤزی جس قسم کی بے عملی کا پرچار کرنا چاہتا ہے اس میں ایک عملی پہلو مضمر ہے۔

دیں لیکن لاؤزی کرم کے اس اصول کو تو تسلیم نہیں کرتا لیکن اس کی بجائے اس کے ہاں ایک دوسرا اصول کارفرما نظر آتا ہے جس کو ہم اصول "عمل اور ردِ عمل" کہہ سکتے ہیں۔ طاؤ کے عمل کی ایک خصوصیت واپس لوٹنا ہے (باب ۴۰) جیسا آگے بڑھتے جاؤ گے اتنا ہی دور ہوتے جاؤ گے اور دور ہو کر واپس لوٹنا پڑے گا (باب ۲۵) وغیرہ وغیرہ۔ اس اصول کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر انسانی عمل کے جواب میں ایک ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اور اس کے جواب میں ایک دوسرا اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اس عمل اور ردِ عمل کے پیچیدہ چکر سے نجات تبھی حاصل ہو سکتی ہے اگر انسان ہر قسم کے عمل سے بے پرواہ ہو جائے۔ (۱)

لیکن اس لاعملی سے یہ مراد نہیں کہ انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے بلکہ اس سے ایک خاص قسم کی

---

(۱) لاؤزی کا یہ نظریہ ٹائن بی کے نظریے سے نتیجے کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ اس بات میں تو دونوں متفق ہیں کہ ہر عمل کے جواب میں کوئی دوسرا عمل سرزد ہوتا ہے۔ جہاں ٹائن بی کی رائے ہے کہ اگر کوئی معاشرہ کسی خاص حالت میں جوابی عمل کی صلاحیت نہیں رکھتا یا وہ ارادی طور پر اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ اس جوابی عمل کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے وہ اس پر کاربند نہیں ہونا چاہتا تو وہ معاشرہ زندگی کے میدان سے نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ ایک باعزت زندگی کے لیے معاشرہ کے لیے حالات کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ضروری ہے مگر لاؤزی کے نزدیک زندگی کی خاطر ہی اس چیلنج کے مقابلے سے گریز ایک بہترین اصول ہے۔ اگر کوئی فرد یا معاشرہ کسی عمل کا کوئی جواب نہیں دیتا تو وہ اپنے لیے بقائے دوام کا مکمل انتظام کر رہا ہے۔

اس تضاد کی شاید توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ دونوں مفکرین کے نزدیک زندگی کا مفہوم کچھ مختلف ہے۔ ٹائن بی جس زندگی کی خاطر جوابی عمل کو ناگزیر سمجھتا ہے وہ تمدن، ترقی اور ارتقائی کش مکش کی زندگی ہے۔ لاؤزی جس زندگی کا طالب ہے وہ سادگی، تنہائی اور قبل از تمدن کی فطری زندگی ہے جس میں نہ زندگی کی کش مکش ہے نہ تنازع للبقا ہے۔ نہ معاشی استحصال اور نہ فرد و سماج کا ٹکراؤ وغیرہ۔

لاعلمی ہے ۔ ہندوؤں کے ہاں بھی اس لاعلمی کا تصور (یعنی ہندوؤں کے ہاں آواگون کے چکر میں پھنسنے کا خطرہ اور لاؤزی کے ہاں ردِّ عمل پیدا کرنے کا ڈر) وہ کوشش کے بجائے ایک مخصوص عمل کے باعث نہیں ہوتی ۔ اس کا باعث وہ نیت یا مقصد ہے جو اس عمل کا موجب ہے۔ اگر انسان اپنا زاویۂ نگاہ بدل لے ۔ اگر اس کا مقصد صحیح ہو، اس کے عمل میں خلوص ہو، اس کی قلبی حالت درست ہو تو اس قسم کا عمل ہر قسم کے بُرے نتائج سے پاک ہوگا ۔ تقریباً ایسی ہی تشریح لاؤزی کے ہاں بھی پائی جاتی ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک عارف کامل لاعلمی سے پوری طرح کامیاب ہوتا اور اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے ۔ (باب ۲) اس لیے کہ اس کا قلب ہر قسم کی نفسیاتی بیماریوں سے پاک ہے ۔ اگر باطن کی طہارت کا اندازہ لاؤزی کے نزدیک دو صفات سے ہو سکتا ہے محبت و شفقت اور عجز و نیاز ۔ کہتا ہے "میرے پاس تین خزانے ہیں ان کو حفاظت سے سنبھال کر رکھو ۔ پہلا خزانہ محبت و شفقت ہے دوسرا حد (اعتدال) سے نہ بڑھنا ۔ تیسرا دنیا میں کبھی اوّل ہونے کی کوشش نہ کرنا (باب ۶۷) انہی اصولوں کی تشریح مندرجہ ذیل اقوال میں ہوتی ہے :-

"کمان کو پورے زور سے کھینچا اور کھینچے رکھو گے تو کاش کم وقت پر رک جاتے ۔ تلوار کی دھار کو خوب تیز کر لو اور وہ دھار زیادہ عرصہ اس حالت میں نہیں رہے گی ۔ جب تمہارے گھر سونے اور چاندی سے بھر جائیں گے تو تم ان کی حفاظت سے تنگ آجاؤ گے ۔ دولت اور عزت پر فخر و غرور کرنا اپنی موت کا گڑھا کھودنا ہے ۔ جب تمہارا کام ختم ہو جائے تو زندگی کی کش مکش سے کنارہ کش ہو جاؤ ۔ یہی قدرت کا طریقہ ہے (باب ۹) ۔

۱: باب ۹ میں حدِ اعتدال قائم رکھنے کے متعلق لاؤزی کا کہنا ہے :

"انسانی معاملات کا انتظام کرنے کے لیے حدِ اعتدال پر رہنے سے بہتر کوئی اصول نہیں ۔ جس نے اس اصول پر عمل کیا اس نے حالات پر وقت سے پہلے قابو پا لیا اور اس طرح ہمیشہ فتحیاب ہونے کی کنجی حاصل کر لی ۔ ایسا ہی شخص ایک ملک پر حکمرانی کرنے کے لیے موزوں ہے ۔ ۔ یہی ہمیشہ کی زندگی اور باقی رہنے والی بصارت کو حاصل کرنے کا راستہ ہے ۔"

یہ کائنات ابدی ہے کیوں؟ اس لیے کہ وہ اپنے نفس کے لیے قائم نہیں اور اسی لیے وہ باقی رہنے والی ہے۔

اس لیے عارف ہمیشہ اپنے آپ کو سب سے پیچھے رکھتا ہے اور اس طرح وہ سب سے پہلے ہوتا ہے۔ وہ اپنے جسم کو ثانوی حیثیت دیتا ہے اور اسی لیے اس کا جسم محفوظ رہتا ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ وہ چونکہ اپنے نفس کے لیے زندہ نہیں رہتا اس لیے اس کی روح ہمیشہ تازہ رہتی ہے!"

(باب ۷)

لاؤزی نے اپنے اخلاقی فلسفے کی تشریح کے لیے عارف کو پانی سے اکثر تشبیہ دی ہے۔ پانی ہمیشہ نیچی جگہ جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے باوجود وہ ہر قسم کی رکاوٹ کو دور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

بہترین آدمی کی مثال پانی کی سی ہے۔ پانی کسی چیز کا مقابلہ نہیں کرتا اور سب کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ ایسی نچلی جگہوں میں رہتا ہے جہاں کوئی رہنا پسند نہیں کرتا، اس صفت کے باعث وہ طاؤ سے مماثل ہے۔

عارف رہنے کے لیے نچلی زمین کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کا دل گہری چیزوں سے محبت کرتا ہے دوسروں سے اس کا سلوک محبت اور شفقت آمیز ہے۔ اس کے الفاظ خلوص کا آئینہ ہیں۔ ریاستی معاملات میں وہ امن کا علمبردار ہے۔ چونکہ وہ کسی سے نہیں جھگڑتا اس لیے کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھاتا

(باب ۸)

بار اٹھانا گویا محفوظ رہنا ہے، جھک جانا سیدھے ہونے کے مترادف ہے، خالی ہوتا ہی بھر جاتا ہے کوئی چیز نہ رکھنا ہی سب کچھ رکھنے کے برابر ہے۔ اس لیے عارف طاؤ کا حامل ہے اور ساری دنیا کے لیے بطور نمونہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتا اور اس لیے نور سے بھرپور ہے۔ وہ اپنے متعلق شیخی نہیں بگھارتا۔ اس لیے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں وہ غرور سے عاری ہے اور اس لیے لوگوں کا سردار ہے۔ چونکہ وہ کسی سے نہیں جھگڑتا اس لیے کوئی اس سے نہیں جھگڑتا۔" (باب ۲۲)

لاؤزی نے جارحانہ رویے کے خلاف احتجاج کیا ہے کہ اس کے نزدیک کوئی خاص رائے رکھنا اور اس کو حق جان کر دوسروں پر عائد کرنا اور ان سے اقرار کروانا بھی ایک قسم کی جارحانہ کارروائی ہے۔ اس کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ نیکی اور بدی کے تصورات کے فرق کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ جب لوگ خوبصورتی کو بطور خوبصورتی سمجھتے ہیں تو بدصورتی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جب نیکی بطور نیکی نظر آتی ہے تو بدی کا تصور بھی اس کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے عارف معاملات کو بغیر عمل کے سرانجام دیتا ہے اور اپنے اصول کی تبلیغ الفاظ کے بغیر کرتا ہے۔ (باب ۲) لاوزی کہتا ہے کہ عارف ہر قسم کے خصوصی تصورات اور جذبات سے عاری ہوتا ہے۔ لوگوں کی رائیوں اور جذبات کو وہ اپنی رائے اور جذبہ سمجھتا ہے۔ میں اچھے آدمیوں کو اچھا کہتا ہوں، برے آدمیوں کو بھی اچھا ہی کہتا ہوں اور اس طرح سب اچھے ہو جاتے ہیں۔ میں دیانت دار آدمیوں پر بھی یقین کرتا ہوں، میں جھوٹے آدمیوں پر بھی یقین کرتا ہوں۔ اس طرح سب آدمی سچے ہو جاتے ہیں۔ (۴۹)

ان بیانات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ لاوزی نیکی اور بدی کے معاملے میں اضافیت کا قائل تھا شاید صحیح نہ ہو۔ وہ مطلق صداقت کا قائل ضرور تھا جیسا کہ باب ۷ سے واضح ہوتا ہے جب وہ عارف کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اپنے الفاظ میں صداقت و خلوص کا علمبردار ہوتا ہے۔ نیکی اور بدی کا یہ اضافی تصور ایک فلسفیانہ عقیدہ کے طور پر پیش نہیں کیا جا رہا بلکہ اس کی حیثیت محض نفسیاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عارف کو چاہیے کہ وہ لوگوں سے سلوک کرتے وقت یہ حقیقت کسی طرح بھی ذہن نشین کرانے کی کوشش نہ کرے کہ ان کی زندگی صداقت یا نیکی سے عاری ہے۔ اس کے برعکس انسان کی فطرت کی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہیے جس سے ان میں اطمینان اور اعتماد پیدا ہو۔ ممکن ہے اس طرح وہ غلط راستے سے ہٹ کر سیدھے راستے پر آ جائیں۔ اصلی مقصد جو لاوزی ذہن نشین کرانا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ محض اختلاف رائے کی بنا پر دوسروں کو غلط کہنا اور ان پر اپنی رائے ٹھونسنا ایک غلط بات ہے جس سے جارحیت پیدا ہوتی اور دنیا میں فتنہ و فساد کی بنیاد پڑتی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لاوزی حق و باطل کی کشمکش اور آویزش سے آگاہ نہیں، یا وہ

لوگوں کو اس رزم گاہ حیات سے مختص فرار کا سبق دینا چاہتا ہے۔ مختلف بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص حالات میں جنگ اور قوت کے استعمال کو ناگزیر سمجھتا ہے لیکن وہ ساتھ ہی اس کی بڑی تاکید کرتا ہے کہ قوت کا استعمال صرف اس حد تک ہونا چاہیے جتنا کہ فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس سے زیادہ کرنا گویا حد اعتدال سے بڑھنا ہے اور اس میں انسان اور معاشرہ کے لیے تباہی ہے۔ چنانچہ باب ۳۰ کے ابتدا میں وہ حکمرانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ جنگ سے سلطنت کی توسیع سے بچنا بہتر ہے۔ کیونکہ جنگ کے نتائج اکثر فتنہ و فساد اور عوام کی تباہی کا موجب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جنگ کے ناگزیر ہو جانے کی حالت میں ایک اچھا جرنیل اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد رک جاتا ہے۔ وہ سامان جنگ کی کثرت پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ مقصد حاصل ہونے کے بعد نہ فخر محسوس کرتا ہے اور نہ شان و شوکت کی نمائش کرتا ہے۔ اس کا یہ اقدام ایک قابل افسوس مجبوری کے باعث تھا۔ وہ جانتا ہے کہ تشدد کا کامل ظہور دار نہیں . . . کیونکہ تشدد طاؤ کے خلاف ہے اور جو چیز طاؤ کے خلاف ہے وہ جلد فنا ہو جاتی ہے۔"

اسی طرح باب ۳۱ میں لکھتا ہے:

"سب چیزوں سے زیادہ فوجی سپاہ گری کا آلہ ہیں جن سے لوگ نفرت کرتے ہیں اس لیے مذہبی آدمی جو طاؤ سے واقف ہے ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب ہتھیاروں کا استعمال ناگزیر ہو جائے تو بہترین لائحہ عمل پرسکون ضبط النفس ہے۔"

لاؤزی نے حکمرانوں کو یہی مشورہ دیا ہے کہ لوگوں کے معاملے میں زیادہ دخل دینا اور زیادہ قانون بنانا نتائج کے لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ باب ۵۷ میں کہتا ہے: جتنی زیادہ بندشیں ہوں گی اتنے ہی لوگ زیادہ غریب ہو جائیں گے۔ جتنے زیادہ تیز ہتھیار لوگوں کے پاس ہوں گے اتنا ہی زیادہ فساد و ابتری ملک میں پیدا ہو گی۔ جتنے زیادہ قانون بنائے جائیں گے اتنے ہی زیادہ چور اور ڈاکو موجود ہوں گے۔ اس لیے عارف کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کرتا اور لوگ اصلاح پذیر ہو جاتے ہیں۔ میں تنہائی پسند کرتا ہوں اور لوگ خود بخود نیک بن جاتے ہیں۔ میں کاروبار میں مشغول

نہیں ہوتا اور لوگ امیر اور خوشحال ہو جاتے ہیں میری کوئی خواہش نہیں۔ اور لوگ سادہ مزاج اور دیانت دار ہیں۔"

ایک بڑے ملک پر اس طرح حکمرانی کرنی چاہیے جس طرح چھوٹی مچھلی پکائی جاتی ہے" (باب ۶۰) یعنی اگر اس کو زیادہ ہلایا جائے تو اس کی شکل خراب ہو جائے گی۔ اس لیے لاؤزی کے نزدیک انسانوں کے معاملات میں زیادہ دخل دینے سے حالات بگڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے: "جب گورنمنٹ کاہل اور بیکار ہو تو لوگ خراب نہیں ہوتے۔ جب حکومت چست اور چوبند ہو تو لوگ بدحال اور پریشان ہوتے ہیں۔" (باب ۵۸) "بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دنیا کو فتح کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اس کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ دنیا ایک مقدس برتن ہے جس میں زیادہ کاٹ چھانٹ فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ جو اسے بنانے کی کوشش کرے گا اُسے خراب کرے گا۔ اور جو اس پر قبضہ کرنا چاہے گا اس سے محروم ہو جائے گا۔" (باب ۲۹)

لاؤزی کا خیال ہے کہ انسان کی فطری حالت پاکیزہ اور نیک تھی۔ خرابی کا باعث غیر فطری انتظامات، قوانین اور پابندیاں ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ سادگی اور فطری زندگی کی خوبی کو چھوڑ کر مصنوعی پابندیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے اور دوسروں کے لیے مصیبت کا باعث بنتے ہیں۔ "جب عظیم طاؤ زوال پذیر ہو گیا تو "انسانیت"، "رحم دلی"، اور "اخلاق" کے تصورات بیدار ہو گئے۔ جب علم اور فن ظاہر ہوئے تو اس سے منافقت ظہور میں آئی۔ جب انسانی تعلقات میں توازن نہ رہا تو "شفیق والدین" اور "فرماں بردار بیٹوں" کے تصورات ظاہر ہوئے۔ جب ملک میں بدنظمی اور طوائف الملوکی پھیلنے لگی تو پھر "وفادار اور وضعدار" کی تعریف ہونے لگی۔" (باب ۱۸) اگر انسان اپنی فطری سادگی پر قائم رہتا تو نیکی، اخلاق اور تقویٰ کا وجود کبھی خطرے میں نہ پڑتا۔ یہ پابندیوں اور ناجائز قوانین کا غیر فطری دباؤ ہے جس کے باعث معاشرے میں تمام خرابیاں پیدا ہوئیں۔ علم و حکمت کو دیس نکالا دے دو تو لوگ سو گنا آرام سے رہنے لگیں گے انسانیت اور

۱: لاؤزی جب علم و فن کو ختم کر دینے کی پرجوش تبلیغ کرتا ہے تو اس کا مطلب ایک تو واقعی یہی ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اخلاق کی تعلیم دینا ترک کر دو تو لوگ اپنے اعزا و اقارب سے محبت کرنا شروع کر دیں گے۔ چالاکی، ہنر و فن، فائدہ وغیرہ کے تصورات کو ترک کر دو تو چور اور ڈاکو اس دنیا سے ناپید ہو جائیں گے، اپنی صحیح فطرت اور سادگی کو برقرار رکھنے کا موقع دو، ہوس اور خواہشات کو ختم کر دو۔ (باب ۱۹)

اگر انسان طاؤ کے ان اصولوں کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہو جاتے، اگر بادشاہ اور وزیر اپنی فطرت صحیحہ کی پیروی کرنا شروع کر دیں تو سارے انسان اپنی مرضی سے ان کی محکومیت اختیار کر لیں اور زمین اور آسمان مل کر ان پر برکت کی بارشیں نازل کریں (باب ۳۲)

لاؤزی موت کی سزا کے سخت خلاف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ لوگ موت سے نہیں ڈرتے اس لیے موت کو سزا دے کر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، لوگ برے کاموں سے نہیں رک سکتے۔ (باب ۷۴)

لاؤزی کے اصول ووئی یعنی لاعملی کی حقیقی روح یہی ہے کہ انسان اپنی فطرت صحیحہ کو تسلیم کرے۔ بیجا پابندیوں سے بچا رہے۔ جارحانہ اور متشددانہ رجحانات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ رحم، شفقت، محبت اور عجز کو اپنا اصول بنا لے اور اس کے بعد اس کا ہر عمل دوسروں کے لیے اور اپنے لیے بھلائی اور خیر کا موجب ہوگا۔ اسی لیے اس کے ہاں زندگی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان اپنی اس فطری حالت کو دوبارہ اختیار کرے جس پر وہ ابتدا میں تھا۔ اس نے ایک ایسی ہی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے جہاں لوگ بڑے اطمینان اور سکون سے زندگی بسر

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) علم کی باریکیاں اور موشگافیاں انسان کو فطری سادگی سے محروم کر دیتی ہیں جس چیز پر وہ زور دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح علم کی تحصیل سے انسان کی سیرت پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوتا جب انسان علوم کی تکمیل کر لیتا ہے تو اکثر اس میں غرور، مقابلہ پر برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اسی سے جھگڑے فساد اور فتنوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ دوسرے اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تو وہ آستین چڑھا کر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ (باب ۳۸)

کرتے ہیں۔ ایک ایسے گاؤں کا تصور کرو جہاں آبادی بالکل مختصر ہے، جہاں سامان کی فراوانی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اگرچہ نقل و حرکت کی تمام سہولتیں موجود ہیں پھر بھی وہاں سے لوگ نقلِ مکانی نہیں کرتے۔ ان کا سلسلۂ علم بالکل محدود ہے حتیٰ کہ وہ گنتی کے لیے رسی کو گانٹھیں لگاتے ہیں۔ آرام سے کھاتے، کپڑے پہنتے اور میلوں ٹھیلوں میں شامل ہوتے۔ ساتھ کے گاؤں اتنے نزدیک ہیں کہ یہاں سے کتے بھونکنے اور مرغوں کی کائیں کائیں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی شخص نقلِ مکانی کا خیال تک بھی نہیں کرتا (باب ۸۰) ایک عارف حکمران کا یہ کام ہونا چاہیے کہ وہ عوام کے پیٹ بھر دے لیکن ان کے دلوں کو خواہشات اور تمناؤں سے خالی رکھے اور علم سے محروم ... تاکہ وہ اطمینان اور امن سے زندگی گزار سکیں (باب ۳) انسان کی اس نیک اور صاف فطرت کو جس کو لاؤزی لوحِ ناکندہ کا نام دیتا ہے معاشرے اور تمدن نے مسخ کر دیا ہے، اس میں حرص، حیوانیت اور تشدد کا اتنا شدید ہیجان پیدا کر دیا ہے کہ اب اس کو قدیم زندگی کی طرف واپس لے جانے کے لیے سوائے ذہنی اور جسمانی ریاضت کے کوئی اور چارۂ کار نہیں۔

لوحِ ناکندہ کی حالت بحال کرنے کے لیے لاؤزی سب سے اول یہ تقاضا کرتا ہے کہ خواہشات کو کم کیا جائے۔ مشرقی صوفیا کی طرح لاؤزی جسمانی ریاضت کا زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے جگہ جگہ جسمانی لذات میں انہماک کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اگر انسان زندگی کی تمام لذتوں سے پوری طرح بہرہ اندوز ہونا شروع کر دے تو اس کا نتیجہ اس کے لیے اچھا نہ ہوگا (باب ۵۵) پانچ رنگ آنکھوں کو چندھیا دیتے ہیں، موسیقی کی پانچ سُریں کانوں کو بہرہ کر دیتی ہیں۔ پانچ مزے زبان کی لذت کو خراب کر دیتے ہیں۔ گھڑ دوڑ اور جانوروں کا شکار وغیرہ ذہن کو پاگل بنا دیتے ہیں۔ (باب ۱۲) لیکن اس کے باوجود لاؤزی کے سامنے جو چیز ہے وہ جسمانی ریاضت سے زیادہ دولت قوت اور شہرت کے جذبات کو کچلنا ہے۔ دولت اور عزت پر غرور کرنا اپنی تباہی کا بیج بونا ہے

---

* ترجمہ مسٹر آرتھر ویلے کے مطابق ہے۔

(باب ۹) دوسرے یہ کہ اس سے لوحِ ناکندہ کا حصول مشکل بلکہ محال ہو جاتا ہے شہرت یا اپنی ذات کی بھلائی ان دونوں میں سے کون سی چیز زیادہ اہم ہے؟ مادی فوائد یا اپنی ذات، ان دونوں میں سے کون سی چیز زیادہ اہم ہے (۴۴) دولت انسان کو ہمیشہ پریشان رکھتی ہے (۱۲) باب ۴۵ میں (مسٹر آرتھر ویلے کے بیان کے مطابق) وہ کہتا ہے کہ دوسروں کے مال کی تمنا کرنے سے بدترین جرم کوئی نہیں، اپنی حالت پر قناعت نہ کرنا تباہی کا پیش خیمہ ہے جب آدمی زیادہ سے زیادہ مال و جاہ کی تمنا کرنا شروع کر دے تو گویا فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔

لوحِ ناکندہ انسان کی فطرتِ صحیح کا نام ہے جسے قرآن کی زبان میں فطرۃ اللہ کہا جا سکتا ہے۔ یہی وہ فطرت ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی اور اسی کی مکمل بحالی لاؤزی کا مطمح نظر ہے۔ اسی سے انسان عرفانِ نفس حاصل کر کے صحیح حکمت سے بہرہ ور ہوتا ہے (باب ۲۲) جب ہم ابتدائی حالت تک پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ہمارا آغاز ہوا تو گویا ہم نے لوحِ ناکندہ یا فطرتِ صحیح تک رسائی حاصل کر لی۔ اس سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے، ہم اپنے مقصدِ حیات سے خبردار ہوں گے اور اس طرح فطرتِ ازلی کے غیر متبدل قوانین کا راز پا کر ہم صحیح بصیرت سے سرفراز ہوں گے۔

(باب ۱۶)

لاؤزی نے مختلف جگہ عارفِ کامل کے متعلق اپنے افکار پیش کیے ہیں۔:

"تمام لوگ خوش ہیں جیسے کہ وہ کسی قربانی یا جشن کے میلے میں جا رہے ہوں صرف میں ہی بیکار ہوں اس بچے کی طرح جو (ابھی) حرکات اور ہنسی سے آشنا ہو، میں اس طرح سرگرداں ہوں گویا میرا کوئی مقام نہیں سب کے پاس کافی سے زیادہ سرمایہ و پونجی ہے صرف میں ایسا ہوں جس نے سب کچھ کھو دیا ہو، اس تمام گروہ میں صرف میں ہی ایک بے وقوف اور کند ذہن معلوم ہوتا ہوں۔ دنیا

۱: قرآن جب میثاقِ ازلی کی یاد دلاتا ہے تو گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی اس حالت کی طرف غور کرے جب وہ اپنی تخلیق کی ابتدا میں تھا۔

کے لوگ پُرامید، زندہ دل اور پُر اعتماد ہیں، حسرت میں ہی مایوس اور مردہ دل ہوں، سمندر کی طرح میں ہر لحظہ مضطرب ہوں، پانی کے تھپیڑے سے جیسے ادھر ادھر دھکیلے جاتے ہیں۔ لیکن معلوم بنا ہے میرے لیے کوئی جائے قرار نہیں۔ سب آدمی کسی نہ کسی کام میں مشغول ہو سکتے ہیں مگر میں ہی کسی کام کے لائق نہیں اور دوسروں کے لیے باعث تمسخر۔ لیکن ایک چیز ایسی ہے جس میں باقی سب انسانوں سے مختلف ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میں کسی ایسی غذا کو پسند نہیں کرتا جو ماں کی چھاتی سے حاصل نہیں ہوتی۔ (باب ۲۰)

یہاں عارف کا وہ روپ بیان کیا گیا ہے جب وہ لوح ناکندہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ اس دنیا کے عام ماحول میں اجنبی سا محسوس کرتا ہے لیکن اس کی قوت اور استقلال کا تمام راز اس میں مضمر ہے کہ فطری غذا کے علاوہ کسی اور شے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور یہی فطرۃ اللہ کی طرف رجوع ہے جو لاؤزی کے نزدیک انسان کے لیے ناگزیر ہے۔

باب ۱۵ میں لاؤزی اسی عارف کا نقشہ کھینچتا ہے جب وہ فطرۃ اللہ یا لوح کندہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے:

"وہ اس شخص کی طرح محتاط ہے جو سردیوں میں کسی ندی کو عبور کرتا ہے۔ وہ اس طرح چوکس زندگی بسر کرتا ہے گویا وہ ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ وہ شعار کی پابندی کرتا ہے گویا کسی کے گھر بطور مہمان جا رہا ہو۔ وہ نرم و لچکدار ہے اس برف کی طرح جو پگھلنا شروع کر دے۔ ناکندہ لکڑی کی طرح ہر قسم کے اثرات سے عاری تاہم پہاڑوں کی نشیبی وادیوں کی طرح وہ ہر شے کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک متلاطم ندی کی طرح تاریک۔ لیکن کون ہے جو اس تاریکی کے باوجود آخر کار صاف و شفاف صورت اختیار کر لیتا ہے؟ وہ کون ہے جو آغاز میں ترشست اور بے حرکت ہوتا ہے لیکن بعد میں زندگی اور حرکت سے معمور ہو جاتا ہے؟ وہ لوگ جو اس طاؤ کے حامل ہیں اپنے آپ کو حد سے زیادہ نہیں بھرتے اور اس لیے ان کی مثال اس کپڑے کی سی ہے جو استعمال سے نہیں گھستا۔ اور جسے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

جب طاؤ کے ذریعے لوح کندہ حاصل ہو جاتی ہے تو انسان کی شخصیت میں غیر معمولی تبدیلی

ہو جاتا ہے اور معرفت کے کئی نامعلوم دروازے کھل جاتے ہیں " وہ شخص جو ماں کو جانتا ہے وہ بیٹوں کو بھی جانتا ہے " (۵۲) یعنی جس نے ذات اصلی مطلق کو سمجھ لیا اس نے کائنات کے ہر جزو سے واقفیت حاصل کر لی۔ چنانچہ عارف کا یہ حال ہے کہ گھر سے باہر قدم رکھے بغیر وہ دنیا کی ہر شے سے خبردار ہوتا ہے کھڑکی سے جھانکے بغیر وہ آسمان و زمین کی حرکات کو جانتا ہے . . . عارف بغیر قدم اٹھائے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے بغیر نظر اٹھائے دیکھ لیتا ہے کرتا کچھ نہیں مگر ہر چیز اور مقصد حاصل کر لیتا ہے " (۴۷) اس سے عارف میں ایک قوت پیدا ہوتی ہے جسے تی یا ڈی کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ چینی زبان میں قوت اور نیکی دونوں کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ لاؤزے کے ہیرو کار کو ایسی قوت حاصل ہوتی ہے جو کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی " (۲۸) اور خود طاؤ ایک خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا (باب ۳۵) اور اس لیے عارف اس دنیا کا حقیقی حکمران ہے۔ وہ اس اخلاقی قوت کی مدد سے ہر انسان کو اپنے اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے اور کرتا ہے اور اس طرح کائنات کا بلند مقصد پورا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوتا ہے۔ (باب ۱۶)

لاؤزے کے نزدیک ایک عارف صوفی کا مقام اس دنیا اور اس کے انسانوں کے درمیان ہے۔ تنہائی کی زندگی ہر اس شخص کے لیے ناگزیر ہے جو اپنے نفس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، خواہ وہ صوفی ہو یا بادشاہ یا عالم آدمی۔ لاؤزے کے ہاں اس قسم کی تقسیم جائز نہیں۔ اس کے ہاں ہر شخص جو اصلاحِ ذات کرے حکومت کا کام سنبھال سکتا ہے اور اس معاملے میں اس میں اور کنفیوشس میں کوئی فرق نہیں، اختلاف صرف طریقہ کار میں ہے۔ جب اس تنہائی میں وہ اخلاقی مقصد حاصل کر لیتا ہے اور اسے مشاہدہ حقائق نصیب ہو جاتا ہے تو پھر اس کا مقام انسانوں کے درمیان ہے۔ تکمیل کے بعد اس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علم سے دوسروں کو بہرہ ور کرے (۸۱) باب ۴۹ میں وہ کہتا ہے: عارف اس دنیا میں بڑی احتیاط سے رہتا ہے اور اس کا کام دوسروں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنا ہے۔ اس کا قلب ہر شخص کی ضرورت اور تکلیف سے متاثر ہوتا ہے " عارف کا یہ کام نہیں کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی ضروریات کے لیے ہاتھ پھیلاتا پھرے۔ وہ شخص جو طے کی (اخلاقی قوت)

سے متعلق ہے خود خیرات اور بخشش تقسیم کرتا ہے۔" (۷۹)

مسٹر آرتھر ویلے کے ترجمے کے مطابق باب ۲۷ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لاؤزی کا عارف دنیا کی اس دنیا کے تمام انسانوں کا ہمدرد ہوتا ہے وہ ہر وقت ہر طرح لوگوں کی مدد کرتا رہتا ہے اور ان سے منہ نہیں موڑتا، یہ نور سے سرفراز ہوتا ہے کامل ولی ناقص کا استاد ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے استاد کی عزت نہیں کرتا اور جو استاد اپنے شاگردوں سے بے اعتنائی برتتا ہے وہ دونوں اپنے علم کے باوجود گمراہ ہیں۔"

لاؤزی کا صوفیانہ تفکر اس کے دو ممتاز شاگردوں چوانگ زی (Chuang Tzu) اور لے زی (Lieh Tzu) کے ہاتھوں ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہا۔ چوانگ زی کے ہاں اکثر وہی مسائل اور وہی نقطۂ نگاہ موجود ہے جو لاؤزی کے ہاں ہم دیکھ چکے ہیں لیکن اس مماثلت کے باوجود کچھ وقت اور حالات کے اختلاف اور کچھ انفرادی پسندیدگی کی وجہ سے ان کے نقطۂ نگاہ میں فرق ضرور نظر آتا ہے۔ خود طاؤ کی تفصیلی بحث میں دونوں میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ لاؤزی کے نزدیک طاؤ اصول مطلق یا حکمت ازلی کا نام ہے جس کا کائنات میں کارفرما ہے اور جو ہر قسم کے شخصی تصورات سے بالا اور ماورا ہے۔ اس کے برعکس چوانگ زی کے ہاں طاؤ کا مقام دوسرے درجے پر ہے۔ وہ علت اولیٰ کے لیے لفظ تین (T'ien) استعمال کرتا ہے جو لاؤزی کے طاؤ کے مقابلے پر زیادہ شخصی نظر آتا ہے۔ اور جس کا مفہوم خدا کے توحیدی تصور سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے نزدیک طاؤ اس خدا کا مظہر ہے جسے ہم لاؤزی کی اصطلاح میں ٹی (Te) کہہ سکتے ہیں یعنی حسن اخلاق وغیرہ۔ اس کے لیے چوانگ زی "خدا کی خوشنودی" کی اصطلاح بھی استعمال کرتا ہے یعنی سکون اور اطمینان قلب کی ایک نفسیاتی حالت۔ اگر اس طرح کے چند انفرادی اختلافات کو نظر انداز کر دیا جائے تو چوانگ زی اور لے زی کے ہاں لاؤزی کے صوفیانہ فکر کے وہی بنیادی اجزا نظر آتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا

---

(۷۹) چینی صوفی کے افکار (سلسلۂ حکمت مشرق نمبر ۵) صفحہ ۱۰

چکا ہے۔ زمانے کے اختلاف کے باعث بدھ مت کے چند تصورات کی جھلک بھی ان کے ہاں پائی جاتی ہے۔ تاریخی طور پر تو بدھ مت چین میں کافی دیر بعد داخل ہوا لیکن اس سے کافی عرصہ پہلے بدھ مبلغ ایشیا کے مختلف حصوں میں پھیل چکے تھے۔ اور ان کے خیالات کی بازگشت ان چینی صوفیوں کے ہاں کوئی بعید چیز نہیں۔ لاؤزی کے ہاں روح کا ایک ممیز تصور موجود نہیں لیکن چوانگ زی[1] اور لیہ زی[2] میں یہ تصور نمایاں شکل میں موجود ہے۔ چوانگ زی کا خیال ہے کہ انسانی روح کائنات کی روح اعظم کی ایک تجلی ہے جو انسانی نفس کے برعکس لافانی ہے۔ جو مختلف حالتوں سے گزرتی ہوئی آخر کار اپنے سرچشمہ روح اعظم سے جا ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کے ہاں شاید ہندو فکر کے زیر اثر اس دنیا کو مایا سمجھنے کا تصور بھی ملتا ہے۔

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

ایک دن وہ یوم عظیم بھی آئے گا جب ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ زندگی محض ایک خواب تھی۔ بیوقوف سمجھتے ہیں کہ وہ اب جاگ رہے ہیں۔ درحقیقت ہم اور تم سب خواب ہیں۔[3] (۴۸)

۱: چینی صوفی کے افکار (سلسلہ حکمت مشرق لندن ۱۹۰۶) صفحہ ۴۳۔

۲: گائلز۔ طاؤ کی تعلیم صفحہ ۴۷۔

۳: چوانگ زو نے اس دنیا کو بے حقیقت ظاہر کرنے کے لیے ایک تمثیل بیان کی ہے۔ کہتا ہے ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک تیتری ہوں جو بڑے مزے سے ادھر ادھر اڑتی پھر رہی ہے۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی اور مجھے محسوس ہوا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا لیکن اس بات کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا کہ آیا میں انسان تھا جس نے اپنے آپ کو خواب کی حالت میں تیتری دیکھا یا اب تیتری ہوں جو اپنے آپ کو خواب میں انسان دیکھ رہی ہے صفحہ ۵۰۔ لیہ زی اسی سلسلے میں کہتا ہے: ہر وہ شے جس میں زندگی کی رمق ہے بے ہودہ شے جو مادی جسم رکھتی ہے محض التباس ہے صفحہ ۶۴۔

تم اور میں دونوں التباس ہیں صفحہ ۶۴

"دُنیا کی تمام مختلف اور متضاد چیزیں، خدا کی تفرقات مٹا دینے والی وحدت میں باہم دگر لپٹی گئی ہیں۔" (۶۹)

"عارف کی آخری پناہ گاہ خدا کی ذات ہے۔ اس کے باعث وہ حزن و ملال سے محفوظ رہتا ہے۔" صفحہ ۵۹۔

رسمی روزہ اور قلبی روزہ کا فرق بیان کرتے ہوئے چوانگ زی کہتا ہے:

"قلبی روزے کے لیے ضروری ہے کہ دل میں وحدت اور یگانگت کا تصور پیدا ہو۔ کانوں سے سننا بند کر دو۔ ذہن سے افکار نکال دو۔ اس کے بعد تمھاری روح میں ایک سلبی کیفیت پیدا ہو گی۔ یہی سلبی کیفیت قلبی روزہ ہے۔" (۷۱)

"تکمیلِ انسانیت یہ ہے کہ انسان اپنے عجزِ علم کا اعتراف کرے۔" (۷۳)

چوانگ زی نے انسانِ کامل کی چند صفات کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک جزیرہ میں چند ایسے انسان موجود ہیں جن کا رنگ سفید ہے جو اناج نہیں کھاتے۔ ان کی خوراک ہوا اور شبنم کے قطرے ہیں۔ وہ ہوا میں اڑتے اور نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ آگ اور پانی انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتے، وہ لوگوں کو بیماریوں سے اچھا بھلا کر دیتے ہیں۔ اور ان کی برکت اور دعا سے کسانوں کی فصلیں زرخیز اور سرسبز ہو جاتی ہیں وغیرہ[1]۔ لے تزی کے ہاں بھی انسانِ کامل کا ایسا ہی تصور موجود ہے اس کی ایک نگاہ دلوں میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ وہ زمین و آسمان کو ایک دم میں تہ و بالا کر سکتا ہے۔ اس کا اثر انسانوں اور بے جان اشیاء پر یکساں ہوتا ہے۔ وہ ہوا میں ہر طرف پرواز کر سکتا ہے[2]۔ یہ لوگ لافانی ہوتے ہیں، ان کے لیے چینی زبان میں لفظ ہسین (hsien) استعمال ہوتا ہے[3]۔ یہاں ہمیں یہ بحث نہیں کہ چوانگ زی یا لے تزی کے ہاں انسانِ کامل کے متعلق جن صفات کا

۱: دیکھیے ہیومز کی مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۹۱، ۹۲ اور گائلز، چینی صوفی کے افکار صفحہ ۵۸

۲: گائلز، طاؤ کی تعلیم صفحہ ۴۷، ۴۸

۳: ہسین کی تشریح کے لیے دیکھیے ڈاکٹر ایس ایم حسن کا مضمون "چین اور انسانی کیمیا، اکبر الدین کا چینی ماخذ" اقبال ۔۔

ذکر کیا گیا ہے وہ حقیقی مفہوم کی حامل ہیں یا بیماری کی بہار سے لیے زیادہ اہم حقیقت یہ ہے
کہ ان تصورات کی روشنی میں چینی تصوف کی تاریخ بالکل ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔

اس تصوف میں کئی مختلف عناصر کی آمیزش ہونی شروع ہوئی۔ یہ تصور پیدا ہوا کہ سمندر میں کچھ
ایسے جزیرے موجود ہیں جہاں لوگ دائمی زندگی کا راز پانے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور ان کے
ہاں ایسی جڑی بوٹیاں موجود ہیں جن کے کھانے سے انسان ہمیشہ کی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔
اس مقصد کی خاطر کیمیا کا رواج ہوا اور [illegible] حفظان صحت وجود میں آیا۔ جادو، کیمیا اور حفظان
صحت تینوں تحریکات نے طاؤ تصوف کو ایک بالکل ہی نئی شکل دے دی۔

سب سے پہلے جادو کا رواج شروع ہوا۔ ۲۲۱ قبل مسیح میں بعض لوگ جو جادوگر کہلاتے تھے
اور جن کا دعویٰ تھا کہ وہ ہمیشگی کی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں چین کے بادشاہ
کے دربار میں جمع ہو گئے جو ان سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ بعد میں ان جادوگروں نے کیمیا
کا کام شروع کیا۔ ان کے پروگرام میں سمندری جزیروں کی جڑی بوٹیاں حاصل کرنے سے
زیادہ ان لوگوں سے ملنا تھا جن کو وہ انسان کامل یا برگزیدہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال
تھا کہ ہر آدمی "جن" بن سکتا ہے وہ صرف ہمیشگی کی زندگی پانے میں کامیاب نہیں ہوتا بلکہ
جادو کی مدد سے غیر مرئی بھی بن جاتا ہے۔

۱۳۳ قبل مسیح میں لی شاؤ چون [illegible] گندھک کو سونے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوا۔
اس تبدیل شدہ دھات کے برتن بنا کر ان میں کھانا کھانے سے انسان کو ہمیشگی کی زندگی
تو نہیں البتہ ایک طویل عمر ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پینگ لائی
([illegible]) جزیرے میں جن کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر مناسب
قربانیاں کامیابی سے دی جائیں تو انسان موت کو شکست دے سکتا ہے لیکن جب کوئی ایسا
انسان کامل مرتا تو لوگ یہ سمجھتے کہ اس نے [illegible] جسم کی قید سے آزاد ہو گیا ہے۔ حقیقی
موت اس پر طاری نہیں ہو سکتی [illegible] ایک [illegible] کی [illegible]

اور چند بکھرے ہوئے کپڑوں کے علاوہ اور کوئی چیز موجود نہ ہوگی۔

اس جادو اور کیمیا کے ساتھ ساتھ حفظانِ صحت کا تصور بھی شروع ہوا۔ چونکہ زی کے ہاں انسانِ کامل کا یہ تصور تھا کہ وہ لازماً انتقال نہیں کرتا۔ اس کے لیے سانس لینے اور دیگر مجاہدات کا آغاز ہوا۔ ان تمام تصورات کی بنیاد اس عقیدے پر تھی کہ اس طرح انسان طویل عمر سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سن عیسوی کی ابتدائی چار صدیوں میں یہ طریقہ تاؤ ازم کا امتیازی نشان سمجھا جاتا رہا۔

اس مکتبِ فکر کے حامیوں کا خیال تھا کہ ہر انسان کے جسم میں تین مرکزِ حیات ہیں۔ ایک سر، دوسرا چھاتی اور تیسرا پیٹ۔ ان تینوں کو علاقہ [illegible] "شنگ تن" کہتے ہیں۔ ہر شخص کے بدن میں ۳۶ ہزار دیوتا مکین ہیں۔ وہی دیوتا جو کائنات پر نگران ہیں۔ مثلاً بائیں آنکھ سورج ہے اور اس میں سورج دیوتا مکین ہے وغیرہ۔ سب سے اہم تین دیوتا ہیں جن میں سے ہر ایک ایک علاقہ "شنگ تن" پر حکمران ہے۔ ان تینوں دیوتاؤں کا سردار طائی (Tai [illegible]) ہے جو سر کے علاقہ "شنگ تن" کے نو مکانوں میں سے ایک مکان میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ والے مکان میں قسمت کا دیوتا مکین ہے۔ اس کے پاس موت کی کتاب ہے (جس میں مرنے والوں کی فہرست درج ہے) اور زندگی کی کتاب بھی (جس میں پیدا ہونے والوں کی فہرست ہے)۔ حفظانِ صحت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنا نام پہلی کتاب سے دوسری کتاب میں منتقل کرا سکے۔ جب تک یہ ۳۶ ہزار دیوتا بدن کے اندر موجود ہیں انسان زندہ ہے۔ جب وہ بدن سے نکل جاتے ہیں تو وہ مر جاتا ہے۔ اس لیے لازمی تھا کہ ان کی کوشش یہ ہو کہ یہ دیوتا اپنی جگہ قائم رہیں۔ یہ کام "اندرونی بصیرت" سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ دیوتا شراب اور گوشت کی بو سے متنفر ہیں اس لیے سالک کے لیے ان سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ ان دیوتاؤں کے علاوہ انسان کے بدن میں تین

۱: اس اصطلاح سے ناقدین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ مکتبِ فکر یا تو بیرونی طاقتوں نے شروع کیا یا ان کے زیرِ اثر وجود میں آیا

۲: اس مکتبِ فکر کے علاوہ طاؤ کے پیرو عام طور پر شراب کو جائز سمجھتے تھے اور ان کے بعض مذہبی مراسم میں شراب ایک ضروری شے تھی۔ جو آج تک [illegible] [illegible]

کیڑے بھی ہوتے ہیں جن میں ہر ایک ایک علیحدہ علاقہ شنگ ات میں موجود ہوتا ہے یہی کیڑے بیماری، بڑھاپا اور موت کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کی خوراک یہی پانچ اناج ہیں[1] اور اس لیے ان سے بچنا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ تاؤ کی طرح کی چند مشقیں بھی ہیں جن کا تعلق سانس کو ایک خاص طریقے سے منضبط کرنا ہے۔ ضبطِ نفس اور تیار شدہ لعابِ دہن ان کے نزدیک بہترین خوراک تھی۔ اگر سالک اپنے آپ کو اس خوراک کا عادی بنا لے اور اس سے مانوس ہو جائے تو اس کا جسم اتنا ہلکا اور شفاف ہو جائے گا کہ اس کا سایہ ناپید ہو جائے گا اور وہ ہوا میں اڑنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس مکتبِ فکر نے ایک تصور پیش کیا کہ طویل عمر حاصل کرنے میں کامیابی کے لیے ان اندرونی دیوتاؤں کا تعاون ناگزیر ہے۔ تمام جسمانی ریاضتیں اور مشقیں بے کار ثابت ہوں گی اگر دیوتا اس کی مدد کے لیے تیار نہ ہوں۔ ان اندرونی دیوتاؤں کو آمادہ کرنے کے لیے اچھے کام کرنا ضروری ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے سڑکوں اور پلوں کی مرمت، یتیم خانوں کی خدمت، غریبوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کی طرف اپنی پوری توجہ کر دی۔ شروع کی بعض الہامی کتب کے مادی پیمانے مقرر تھے۔ چنانچہ ۳ گناہوں کا نتیجہ بیماری، ۵۰۰ گناہوں کا نتیجہ مردہ بچے کی پیدائش وغیرہ ہے جس نے ۳۰۰ نیکی کے کام کیے وہ ارضی بقا کا درجہ حاصل کرے گا اور اگر اس نے ۱۲۰۰ نیکی کے کام کیے تو وہ آسمانی بقا حاصل کرے گا لیکن ایک غلط قدم اس تمام کمائی کو برباد کر سکتا ہے۔

بدھ مذہب چین میں پہلی صدی عیسوی میں رائج ہونا شروع ہوا۔ اس نے تاؤ مت کے اس مکتبِ فکر پر کافی اثر ڈالا۔ عجیب بات یہ ہے کہ شروع میں بدھ مت روح کا قائل نہ تھا لیکن بدھ مت کی جو شکل چین میں مروج ہوئی اس میں روحِ انسانی کا تصور بہت نمایاں تھا۔ بدھ کی تعلیم

۱۔ چاول، باجرہ، گندم، جو، لوبیا وغیرہ۔

یہ بھی کہ انسان محض پانچ چیزوں کا مجموعہ ہے یعنی جسم، تاثرات، ادراکات، جذبات اور شعوری اعمال۔ چین میں بھی طاؤمت کے دور میں اسی قسم کا تصور موجود تھا۔ جب انسان مرتا ہے تو اس کا ایک حصہ (ہن) آسمان میں اپنے آباد اجداد سے جا ملتا ہے۔ دوسرا حصہ (پو) قبر کے پاس رہتا ہے یہاں تک کہ وہ کمزور ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ ان دونوں حصوں کی زندگی کا دار و مدار نفسِ حیات (چی) پر ہے جو موت کے وقت منتشر ہو جاتا ہے۔ اگر میت کے وارث قربانیوں سے ہن اور پو کی پرورش نہیں کرتے تو وہ ارواحِ خبیثہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اپنے ان وارثوں سے انتقام لینے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ان میں سے کسی جز کو بھی روح نہیں کہا جا سکتا۔ ایک دفعہ جب یہ جسم سے خارج ہو جائیں تو ان کو یکجا کرنا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینیوں کے ہاں بقا کا تصور محض جسمانی ہے۔ لیکن بدھ مت نے چینیوں کو روح کی بقا، جنت اور دوزخ کے تصورات سے روشناس کرایا۔ جسمانی بقا کے بجائے اب حقیقی روحانی بقا قرار دیا جانے لگا۔

دوسری صدی عیسوی کے وسط میں چین کے صوبہ زیچ وان[1] میں طاؤمت کے پیروؤں میں ایک مذہبی ریاست کے قیام کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس کے سربراہ نے اپنے لیے شیخ ملکوتی کا لقب اختیار کیا[2]۔ اس کا نمایاں کارنامہ بیماروں کو تندرست کرنا تھا۔ اس کے بعد اس تحریک کے دوسرے سربراہ نے بیماروں کو تندرست کرنے کے لیے ان کو تنہائی میں قید کرنے کا طریقہ شروع کیا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ بیماری گناہ کا نتیجہ ہے اور تنہائی میں انسان اپنے گناہوں کا احساس کر کے ان پر ندامت کا اظہار کرے۔ اس کے بعد کے ایک اور شیخ ملکوتی نے دینی ریاست کو بہت زیادہ مستحکم بنایا۔ اس نے راستوں پر سرائیں کا انتظام کیا۔ جہاں مسافروں کی بلا معاوضہ خدمت کی جاتی تھی۔

---

1. زیچ وان مغربی چین کا صوبہ ہے جو چین کے باقی علاقوں سے پہاڑوں کے باعث منقطع سا ہے۔

2. شیخ ملکوتی چینی زبان کے تین شی ([illegible]) کا ترجمہ ہے۔ تین کے معنی آسمان یا ملکوت کے آتے ہیں۔ لفظ [illegible] لسانی تبدیلیوں کے باعث شیخ میں تبدیل ہو گیا۔ دیکھیے ڈاکٹر [illegible] کا مضمون۔

مجرموں کو پہلے تین جرموں پر کوئی سزا نہ ملتی لیکن اس کے بعد ان کو بطور سزا سڑک کا کچھ حصہ مرمت کے لیے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ موسم بہار اور گرما میں جانوروں کا مارنا اور منشیات کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ اس تحریک کے ایک دوسرے سربراہ نے بیماروں کے علاج کے لیے پانی اور لوبان کا استعمال شروع کیا۔

اس دینی ریاست کی تحریک کی کمزوری کے بعد چین میں ایک اور نئی تحریک شروع ہوئی جس کو مسلک امن اعظم کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کا شمالی چین سے تعلق تھا۔ ۱۷۵ عیسوی میں اس نے وسطی اور مشرقی صوبوں میں اپنے مبلغ بھیجنے شروع کیے۔ اس نے اپنے دینی نظام کو زیادہ منضبط کیا اور ہر شعبہ کے عہدہ دار مقرر کیے۔ ملک کے حالات بہت ناخوش گوار تھے اور عوام کی معاشی حالت بہت ناگفتہ بہ تھی۔ وبائی بیماریاں اور قحط عام ہو گئے۔ اس کے باعث لوگ جوق در جوق طاؤمت کی اس نئی تحریک میں شامل ہونے لگے۔ انھوں نے چین کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اجتماعی عبادت کا تصور پیش کیا۔ ان کے اجتماعات میں زیادہ رونق ہونے لگی۔ حکمرانوں کو ان سے ایک قسم کا خطرہ محسوس ہونے لگا اور انھوں نے اس تحریک کو دبانے کی کوشش شروع کی۔ اس تحریک کے لاکھوں علمبرداروں نے زرد رنگ کے رومال سر پر باندھ لیے اور مقابلے کے لیے نکلے لیکن آخرکار ۱۸۵ عیسوی کے قریب انھیں شکست ہوئی اور ان کی فوجی اور اجتماعی قوت ختم ہو گئی۔

اس تحریک کا مرکزی محور لاؤ زی کی کتاب ٹاؤ ڈی چنگ تھی جس کا حفظ کرنا ہر عالم کے لیے ضروری تھا۔ ایک عام اجتماع میں لوگ اپنے گناہوں پر ندامت کا اظہار کرتے اور اس طرح وہ اپنے گناہوں سے پاک ہو جاتے۔ بعض پیچیدہ رسوم کی ادائیگی بھی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ ہنری میسپرو نے اس تحریک کے چند رسوم کی ادائیگی کی تفصیل بڑی عمدگی سے بیان کی ہے جو ان کے خاص روزہ کے متعلق تھی۔

ایک کھلی جگہ ایک اونچی قربان گاہ کے گرد یہ رسم منائی جاتی۔ صبح سویرے اٹھ کر آتے اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اور منہ پر مٹی ملی ہوئی جس سے اپنے جرم و گناہ کا اقرار مقصود تھا، بعض مقدس کتب (یعنی لاؤ زی کی کتاب) کے پاس کھڑے ہو جاتے اور اپنی زبان

کے برتنوں کے پاس ٹھہر جاتے، ڈھول بجنے شروع ہوتے، پروہت دیوتاؤں کا نام بلند آواز سے پکارتے ہیں، مناجات و منتر گائے جاتے ہیں۔ موسیقی کی تال پر پروہت گناہوں کا ذکر کرتا ہے اور باقی لوگ اس کے ساتھ ساتھ دہراتے ہیں۔ موسیقی اور الفاظ کی خوشبو سے تمام ماحول میں ایک قسم کی تیزی اور بشارت سرایت کر جاتی ہے۔ ایک آدمی مجمع سے نکل کر اس مقدس جگہ کے درمیان میں آکر زمین پر گر پڑتا ہے، ہر طرف لوٹتا ہے۔ مٹی بدن پر ملتا ہے اور بلند چیخ و پکار کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا شخص اور اس کے بعد دوسرے اس میں شامل ہوتے ہیں۔ کھڑے ہوئے لوگ اپنی ٹوپیاں پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور زمین پر لوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ شور و غوغا انتہا تک پہنچتا ہے تو پروہت رک جاتا ہے۔ سب کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کے سانس اور دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی ہیں، پروہت پھر تمام لوگوں کے نام پڑھ کر سناتا ہے۔ اس کے بعد وہ تیسری بار دعائیں پڑھتے ہیں۔ وہ زمین پر سجدہ کرتے ہوئے دیوتاؤں سے اپنے آباؤ اجداد کے لیے گناہوں کی معافی اور اپنے لیے صحت اور طوالتِ عمر کی دعا مانگتے ہیں۔ منتر اور نماز پڑھنے کے بعد یہ رسم ختم ہو جاتی ہے یہی رسم دوپہر اور رات کو دہرائی جاتی ہے۔ یہ عمل نو دن تک چلتا ہے جس میں حصہ لینے والوں کو ان میں صرف ایک بار کھانا کھانے کی اجازت ہے۔[1]

اس کے ساتھ ساتھ کیمیا سازی کی بھی ترقی ہوتی رہی۔ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب سان تنگ چی ہے جو ۱۴۲ عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ اس میں اکسیر بنانے کے کچھ عجیب و غریب طریقے بتائے گئے ہیں۔ اس کے مصنف کا خیال تھا کہ اس اکسیر کے کھانے سے انسان دنیا کی مادی اور روحانی پریشانیوں سے رہائی حاصل کر لیتا ہے اور تکمیلِ انسانیت کا مرتبہ پا لیتا ہے۔ ۱۴۲ عیسوی تک

۱: دلشی ہومز، کتاب مذکورہ بالا، صفحہ ۱۲۲۔ یہ رسم صوفیوں کی قوالی سے کسی حد تک مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً گانا، کپڑوں کا پھاڑنا، مریدوں کا تڑپنا اور تڑپنا وغیرہ، زمین پر سجدہ ریزی، مزاروں پر مناجات وغیرہ اجزا دوسرے مذاہب کی عبادت سے لیے گئے ہیں۔

کوہنگ نے باؤپوزو نامی کتاب لکھی جو شین (...) یا جن بننے کے فن پر بحث کرتی ہے۔ اکسیر کی تیاری سے پہلے انسان کو چاہیے کہ ایک سو دن تک لہسن، پیاز وغیرہ ترک کر دے جنسی پاک بازی بھی اس کے نزدیک ناگزیر ہے۔

شین یا جن بننے کے کئی درجے ہیں۔ ان مراتب کا انحصار اکسیر کی نوعیت پر ہے۔ سب سے بلند رتبہ وہ شخص ہے جس نے سونے کی اکسیر استعمال کی ہو اور بارہ سو نیک اعمال سر انجام دیے ہوں۔ ایسے لوگ دن کی روشنی میں آسمان پر چڑھ سکتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر یہ پسند کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر چڑھنے کی بجائے اس دنیا ہی میں رہیں اور لوگوں کو کنفیوشس کی تعلیم اور بعض کو کیمیا سازی کے علم سے روشناس کریں۔ دوسرے مرتبے کے شین میں نہ اپنی اور نہ غیروں کی فلاح و بہبود کی قوت ہوتی ہے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا اور اس کے تفکرات سے بالکل آزاد رہے۔

باؤپوزو میں مذکور ہے کہ جڑی بوٹیوں، آگ، ضیا القلس وغیرہ کی مدد سے ہم حصِ زندگی کو طویل کر سکتے ہیں لیکن ہمیشگی کی زندگی حاصل کرنے کے لیے اکسیر کا استعمال ضروری ہے۔ اس استعمال سے انسان میں بے شمار جادو کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ کوہنگ نے پانی پر چلنے، مُردوں کو زندہ کرنے وغیرہ کے لیے متفاوت نسخے تجویز کیے ہیں۔ اس کے ہاں اس چیز کا بھی تذکرہ موجود ہے کہ دنیا کی ہر خواہش و ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک گولی کا استعمال کافی ہوتا ہے۔

چوتھی صدی عیسوی کے بعد کیمیا سازی اور حفظانِ صحت کے اصولوں میں ایک نئی تبدیلی ظاہر ہوئی مثلاً ہوئی سو (۵۱۵ ... عیسوی) کی تصنیفات میں ظاہری کی بجائے باطنی اکسیر کا ذکر موجود ہے یعنی ایک صحیح کیمیا دان کا کام یہ نہیں کہ مادی اجزاء سے ایک مادی اکسیر تیار کرے۔ بلکہ اپنی نفسیاتی زندگی کو اس طرح تبدیل کرے کہ اس نے گویا ایک قسم کی باطنی اکسیر استعمال کی ہے

بدھ مت چین میں پہلی صدی عیسوی میں رائج ہوا۔ اور اس کی مقبولیت کے باعث طاؤ مت

کے پیروؤں نے اپنے نظامِ فکر میں کچھ تبدیلیاں کرنا شروع کیں، بدھ مت کا نصب العین انسان (ارہت) ایک ایسا شخص جو صرف اپنی ذات کے لیے نروان کا متلاشی تھا لیکن بعد میں مہایان بدھ مت کا نصب العین ارہت کی بجائے بدھ ستوا (یعنی ہونے والا بدھ) تھا، جو بے شمار زندگیوں میں نیکی کے کام کرنے کے بعد اور بصیرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو کر لیکن محض اپنی ذات کے لیے نجات حاصل کرنا اس کو پسند نہ آیا چنانچہ اس نے اپنی مرضی سے اپنے مقصدِ اولیٰ یعنی نروان کو ترک کر دیا تاکہ دوسرے انسانوں کو اس بلند مقصد تک پہنچنے میں مدد دے سکے لیکن چونکہ ہر شخص کے لیے اس بلند ترین منزل تک پہنچنا ممکن نہیں اس لیے بدھ ستوا کا کام یہ قرار پایا کہ وہ لوگوں کو صحیح مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے، ان کو خطرات سے محفوظ رکھے اور اگلی پیدائش میں ایک بہتر مقام حاصل کرنے میں معاونت کرے، وہ گویا ایک رحم و محبت کا دیوتا تھا۔

طاؤمت کے ابتدائی دیوتا یا تو فطرت کے مظہر تھے یا ایسی طبیعی قوتوں کے نمائندے بعد میں ان دیوتاؤں کے ساتھ چند لافانی انسانوں کا ایک گروہ (یعنی شین) بھی شامل کر لیا گیا۔ یہ تھے تو انسان مگر انھوں نے حفظانِ صحت کے اصولوں کی مدد سے دیوتا کا درجہ حاصل کر لیا تھا بدھ مت کے زیرِ اثر طاؤمت کے پیروؤں نے ان لافانی انسانوں کو معاونین کا لقب دینا شروع کیا جو لوگوں کو راہِ راست پر چلنے کی ہدایت اور مدد کرتے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اوتار کا عقیدہ بھی اختیار کر لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بعض لافانی معلمین مثلاً لاؤزی اس دنیا میں بار بار مختلف شکلوں میں نمودار ہوتے رہتے ہیں تاکہ وہ عارفین کی راہنمائی کر سکیں لیکن ان اوتار کے باوجود طاؤمت میں ایک ایسے مذہبی تصور کی کمی محسوس کی جاتی رہی جو رحم و شفقت کا سرچشمہ ہو جس کے آگے لوگ اپنے دل کا حال کھول کر بیان کر سکیں جو مشکلات میں ان کو تسکین دے سکے اور جس کے دل کو وہ اپنی دعاؤں سے تبدیل کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے طاؤمت کے پیروؤں نے تین سماوی دیوتا کا تصور پیش کیا۔ اس کے لفظی معنی آسمانی عزت مآب لاؤزی تھا ...

آسمان اور زمین کا خالق اور حکمران ہے۔ تمام بنی نوع انسان اس کی مخلوق اور ان کی نجات اس کا مطمع نظر ہے۔ وہ ہر دور کے آغاز میں مقدس کتاب اپنے ماتحت دیوتاؤں یا الوہی انسانوں کی مدد سے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ اس میں وہ تمام طریقے درج ہوتے ہیں جن کے ذریعے انسان خدا کی مدد حاصل کر سکتا ہے اور مرنے کے بعد جنت میں داخل ہو سکتا ہے[1]

بدھ مت کی پیروی میں تاؤ مت میں بھی درویشوں اور مریدوں کے لیے خانقاہیں قائم کی گئیں۔ ان کے مکین مجرد کی زندگی بسر کرتے۔ عورتوں کے لیے علیحدہ خانقاہیں تھیں۔ ان کی اخلاقی زندگی کافی بلند تھی۔ پانچویں صدی عیسوی میں ایک شخص "کھیئن شہ" نے تاؤ مت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ۴۱۵ عیسوی میں ایک روایت کے مطابق ایک روح آسمانی نے اس پر نزول کیا۔ اُسے الہام ہوا کہ "جب سے تین شی چانگ لنگ (ایک مصلح کا نام) نے اس دُنیا سے کوچ کیا خلوص اور نیک نیتی اس دُنیا سے ختم ہو گئی ہے۔ ۔ ۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ تمھیں اس منصب کے لیے منتخب کروں۔ تمھارا فرض یہ ہے کہ اس دُنیا سے باطل کے اصولوں کو ختم کرو۔ تاؤ ازم کے ٹیکسوں اور غیر اخلاقی رسوم کو بند کراؤ۔ تمھارا اولین فرض یہ ہونا چاہیے کہ انسانوں میں اخلاقی اعمال کے اصولوں کو رواج دو اور کھانے اور درویشوں کو صحیح اصولوں کے مطابق منضبط کرو۔"[2]

---

۱ : خدا کی طرف سے چند منتخب انسانوں کو اس کا پیغام پہنچنا اور ان کا انسانوں تک پہنچانا سامیین کی دینی تاریخ میں ایک اہم تصور تھا۔ یہودیوں اور زرتشتیوں کے ہاں پیغمبر کا مقام اسی تصور کا آئینہ دار تھا۔

۲ : یہ تصور الہامی مذاہب کے تصور پیغمبر کے مشابہ ہے۔